تصوف : تاریخ وتہذیب اور رسم وحقیقت

خواجہ حسن ثانی نظامی

''اسلام''وہ کراماتی لفظ ہے جو''کتاب اور سنت''۔قرآن اور حدیث'' کے بغیر نہ خیال میں آتا ہے، نہ قلم اور روشنائی کی مدد سے کاغذ اور تحریر میں ابھرسکتا ہے، نہ زبان اور تقریر اسے بیان کرسکتی ہے۔''کتاب اور سنت'' کی حیثیت''کسوٹی'' کی بھی ہے اور روشنی کی بھی ! یہ دونوں جہاں جہاں موجود ہوں، وہاں نہ کسی کھوٹ کی گنجائش نکلتی ہے، نہ ملاوٹ کی اور نہ ادھر ادھر بھٹکنے کی ! نیز کم وقت میں بھی زیادہ بات کہی جاسکتی ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زیادہ بات کیا ؟ جو بات بھی کہنے کی ہے اور کہی جاسکتی ہے، وہ سب کی سب تمام وکمال کے ساتھ پوری کی پوری کہی جا چکی ہے ۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ پچھلے چودہ سو سال کی مدت میں خالص منطقی اور علمی بنیادوں پر کون سی بحث ہے جو نہیں ہوئی ۔کیا ایسا لٹریچر کسی اور آسمانی کتاب کے بارے میں موجود ہے ؟ کیا ایسی بحث کسی اور پیغمبر کی حیات اور تعلیمات کے بارے میں ہو چکی ہے، جیسی بحث پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مفید اور صدق آثار زندگی کے بارے میں کی گئی ہے؟ میں بے تکلف کہوں گا کہ یقیناً نہیں !

یہ عقیدہ صوفیائے کرام کے وابستگان کا ہی نہیں، سب مسمانوں کا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لئے ہادی اور نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، بلکہ ان کا پیغام قیامت تک کے لئے ہے اور سب کے لئے ہے ۔ مزید یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی ابتدا سے انتہا تک دین کی جو مکمل ترین شکل ہوسکتی تھی، وہی مکمل دین پیغمبر آخر الزماںؐ کے ذریعے ہمارے اور آپ کے سامنے آیا ہے ۔ اس لحاظ سے قرآن و حدیث اور اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ میں وہ دن خاص اہمیت کا حامل ہے، جس دن قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی :

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً "[۱]

(آج کے روز میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی رحمت کو تمام کردیا اور

تمہارے لئے مذہب اسلام کو پسند کر لیا)

گویا اس روز کے بعد جو زمانہ آیا یا آئے گا، اس میں کتاب وسنت اور اسلام کی شرح اور تفسیر نو کی جا سکتی ہے ۔اس کے باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف نکات تو بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس ساری تعلیم میں نہ کسی اضافے کی گنجائش اور اجازت ہے نہ کمی کرنے کا موقع اور فرصت ۔

فضائے بسیط اور ناپیدا کنار خلاء کے جو دروازے ہمارے زمانے میں کھل رہے ہیں اور جس کے حال سے عام آگاہی چودہ سو سال پہلے یقیناً نہیں تھی، وہ بھی در اصل نبی کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعہ معراج اور اقوال کے ذریعے آخری دین کے لئے کھولے گئے ہیں، ورنہ کون سا دن تھا اور کون سی رات تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے معراج کا دن اور معراج کی رات نہیں تھی ۔ نیز یہ ارشاد سرسری طور پر نہیں ہوا تھا کہ کائنات کی تخلیق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات گرامی کے لئے کی گئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اس وقت بھی موجود تھا جب آدمؑ ابھی آب وگل میں نہیں آئے تھے ۔ یہ ارشاد ماضی کی تاریخ ہی سے پردہ نہیں اٹھا رہا تھا، مستقبل کے امکانات کو بھی روشن کر رہا تھا ۔ دوسرے الفاظ میں مذکورہ بالا آیت نے شریعت محمدی کا نفاذ ان علاقوں اور زمانوں تک وسیع کر دیا ہے جو چودہ سو برس پہلے تو کیا، خود ہمارے لئے بھی نا معلوم ہی ہیں۔لیکن کل انشاء اللہ معلوم اور دریافت ہو جائیں گے ، یعنی آخری پیغام مکمل پیغام ، آخری آیت اور آخری شریعت کے مخاطب انسان جہاں جہاں جائیں گے ، جب جب جائیں گے ، جیسے جیسے جائیں گے، یہی شریعت ان کے ساتھ جائے گی ۔یعنی اس کا اثر ونفوذ نہ عرب وچین تک محدود تھا ، نہ ایران، توران ، افریقہ ، آسٹریلیا ، یورپ اور امریکہ تک محدود ہے ،نہ آنے والے وقتوں میں کبھی محدود اور مسدود ہوسکتا ہے ، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اور نو دریافت علاقوں میں اور دنیاؤں میں بھی اس کو نافذ کیا جائے گا اور ان مقامات پر کوئی مخلوق اگر پائی گئی تو اس کو بھی شریعت محمدی ہی کی پیروی کرنی ہوگی۔ گویا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ان کی لائی ہوئی شریعت نہ منسوخ ہوئی، نہ منسوخ ہوگی۔ یہ زمان و مکان کی پابند ہر گز نہیں بنے گی ۔زمان و مکان(time and Place) البتہ اس کے پابند رہیں گے ۔

ان حالات میں تصوف اگر کوئی ایسی چیز ہے جو مذکورہ بالا دن اور آیت شریفہ کے نازل ہونے کے بعد نمودار ہوئی یا پہلے سے تھی؟ (اور اس تسلسل ہی میں تھی جس تسلسل سے دین اسلام ہر زمانہ

میں آتا رہا اور آخری پیغمبر پر مکمل ہوا)اگر آخری شریعت نے سابق کی بعض چیزوں کے ساتھ اسے بھی منسوخ اور کالعدم کر دیا تو پھر اس کا تعلق نہ تو معروف اور جانے پہچانے صوفیاء اور بزرگوں سے دیکھا ناممکن ہوگا، نہ ہم جیسے بزرگوں کے عقیدت مند اور وابستگان اس سے کوئی ایسا تعلق رکھنے کے لئے آزاد ہوں گے جیسا کہ تعلق مذھبی عقیدے کی بناء پر رکھا جاتا ہے ۔ ہم تو صرف اس عقیدے کو مانتے ہیں اور مان سکتے ہیں جو اسلام سے قرآن سے اور پیغمبر آخر الزماںؐ اوران کے طریقے سے جڑا ہوا ہو۔ یہاں یہ بات لحہ بھر کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ جس چیز کا تعلق اور جوڑا اسلام سے قرآن سے ہو اس کے دائرہ کار سے نہ ماضی باہر ہے ،نہ حال نہ مستقبل ۔ اس کی جو لان گاہ سے تو کچھ بھی باہر نہیں ، ہر اچھی چیز کو حدیثِ نبوی کے الفاظ میں مومن کا گم شدہ مال سمجھنا چاہیے ۔ہاں ! روک ٹوک ہے تو یہ ہے کہ ترک و اختیار روز مرہ کا اصول رہا ہے اور رہے گا ،معروف اور منکر کا فرق ضروری ہے ۔مصلحت ،ضرورت ،حکمت کا زمانے ہی کا تقاضہ نہیں اسلام کا تقاضا بھی ہے، کہ اسلام مملکت زمان ومکان کا اصل حکمراں ہے ۔

ایسا عقیدہ اپنی اصل کو قائم کرنے کے لئے اس تک عام رسائی کے لئے کھری تاریخ بھی مانگتا ہے اور اس تاریخ میں رسم وحقیقت دونوں کو اپنے اپنے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کا متقاضی بھی ہوتا ہے کہ جو خط و خال نظر آرہے ہیں، وہ پیوند کاری تو نہیں ہے ؟ اورجس چیز کو تہذیب کے نام سے یاد کیا جارہا ہے، وہ کوئی پلاسٹک سرجری تو نہیں تھی ؟ اس کا اصل روپ کیا تھا ؟ اہل تصوف اس لفظ کو اسلام کے ساتھ جڑا ہوا اس لئے سمجھتے ہیں کہ تصوف کا وجود مذکورہ آیت کے نزول سے پہلے بھی تھا ۔ ہمارے تصوف کی تاریخ اسلام کے مکمل ہونے کے بعد نہیں، بلکہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوتی ہے ۔ بلکہ اس کی موجودگی اس اسلام کے زمانے میں بھی نظر آتی ہے جو پیغمبر آخر الزماںؐ سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کے لئے اپنے وقت پر آتا رہا ۔ اور اسے کسی نے بھی اور کبھی بھی قابل ضبطی اور منسوخی نہیں سمجھا ۔کسی سے میری مراد انبیاء علیہم السلام اور شریعت لانے والوں سے ہے ۔

تصوف کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ابتدا میں یہ ایک حقیقت تھی بے لفظ، لیکن میری گذارش یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت پہلے ہی دن سے لفظی پیراہن کے ساتھ موجود تھی ۔ لفظ ''صوفی'' کی تحقیق میں بہت سی تھیوریاں سامنے آچکی ہیں ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی

مشہور کتاب تاریخ مشائخ چشت میں اس پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے ۔ اور تقریباً سب ہی تھیوریاں نقل فرمائی ہیں اور لکھا ہے کہ جمہور صوفیاء کا خیال ہے کہ لفظ صوفی صوف سے مشتق ہے۔انہوں نے صوفیہ کے ظاہری لباس یعنی صوف سے بنے ہوئے اونی کپڑوں کا ذکر بھی فرمایا ہے، لیکن جو بات سب سے اہم انہوں نے دریافت فرمائی ہے اور لکھی ہے عام لوگ طویل بحث کے دوران اس سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ پروفیسر نظامی صاحب جیسے معتبر ماہر تاریخ کا کتاب اخبار مکہ کی اس روایت کو تسلیم کرنا معمولی بات نہیں ہے کہ لفظ ''صوفی'' اسلام سے پیشتر بھی رائج تھا ۔ ۲

نظامی صاحب نے شیخ ابو النصر سراج کی اس رائے کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ اس اصطلاح کو بغدادیوں کی ایجاد نہیں مانتے، بلکہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں رائج تھا اور ان کا زمانہ صحابیوں کی معاصرت کا تھا ۔ کتاب اللمع کا اقتباس ہے :

كان يعرف هذا لاسم فی وقت حسن بصری روی عنه انّه قال رايت صوفيا فی الطواف وروی سفيان الثورء انّه قال لو لا ابو هاشم الصوفی ما عرّفت رقيق الرياء وقد ذكر فی الكتاب الّذی جمع فيه اخبار مكه عنه محمد بن اسحاق وغيره يذكره فيه حديثاً ان قبل الاسلام قد خلت مكة فی وقت من الاوقات حتی كان لا يطوف بالبيت أحد وكان يجيء من بلاد بعيدةً رجل صوفی فيطوف بالبيت و ينصرف ، فان صح ذٰلك يدل على ان قبل الاسلام كان تعرف هذ الاسم وكان ينسب اليه اهل الفضل والصلاح ۔ ۳

(ترجمہ) یہ لفظ (یعنی صوفی)حسن بصریؒ کے زمانے میں معروف تھا چنانچہ ان سے مروی ہے کہ میں نے ایک صوفی کو طواف کرتے ہوئے دیکھا ۔ سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء خفی کو نہ سمجھ سکتا ۔ کتاب تاریخ مکہ میں محمد بن اسحٰق وغیرہ سے مروی ہے کہ اسلام سے قبل ایک بار مکہ خالی ہو گیا ۔ اس وقت بیت اللہ کا طواف کرنے کے لئے کوئی متنفس باقی نہ رہا ۔ البتہ کسی دور دراز علاقے سے ایک صوفی مرد آتا تھا اور طواف کر کے واپس چلا جاتا تھا ۔ اگر یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ثابت ہوگا کہ اسلام سے پیشتر بھی یہ لفظ مستعمل تھا اور ارباب فضل و صلاح کے لئے بولا جاتا تھا ۔

پروفیسر نظامی نے ابو محمد جعفر بن احمد بن حسین السراجی القادری کے حوالے سے امیر معاویہ کے

ایک خط کا ذکر بھی کیا ہے کہ جو انہوں نے ابن امر الحکم، گورنر مدینہ کو لکھا تھا۔ اس میں ایک شعر یہ تھا:

قد کنت تشبه صوفیاً له کتب من الفرائض و آیات فرقان ۔[۴]

(ترجمہ) تو مشابہ تھا ایسے صوفی سے جس کے پاس کتابیں ہوں ۔جن میں فرائض اور آیات فرقان موجود ہوں ۔

اپنی طویل بحث کے بعد نظامی صاحب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس روایت کو اگر صحیح مان لیا جائے تو صوفی کا لفظ پہلی صدی ہجری میں استعمال ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

پروفیسر نظامی صاحب نے حد درجہ محتاط تاریخ نویس ہونے کی بنا پر لفظ اگر کے ساتھ یہ بات مانی ہے کہ لفظ صوفی اسلام کے قرن اول میں موجود تھا، لیکن علامہ آلوسی نے تاریخ عرب بیان کرتے وقت کسی قسم کا شک ظاہر کئے بغیر یہ دلچسپ روایت نقل فرمائی ہے کہ پہلا آدمی جسے صوفی کہا گیا ہے، صوف کا لباس پہننے کی وجہ سے صوفی نہیں کہلایا بلکہ عبادتوں اور ریاضتوں اور انسانوں کی خدمت کی وجہ سے خود صوف کی طرح سوکھ جانے کی بنا پر صوفی مشہور ہوا۔

علامہ محمود سکری آلوسی (متوفی ۱۹۲۴ء) اگرچہ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے شاید انہیں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کا قرب حاصل رہا تھا، انہیں کیا غرض پڑی تھی کہ تصوف کی تاریخ کو پیغمبر آخر الزماںؐ کی بعثت سے پہلے کے زمانے تک پہنچائیں ۔وہ اپنی مشہور کتاب بلوغ الادب میں لکھتے ہیں:

''صوفہ لقب ہے غوث بن مر بن اد بن طانجہ بن الیاس بن مضر کا ۔ اسے اور اس کی اولاد کو صوفہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی والدہ کے یہاں اولاد نہ ہوتی تھی ۔اس نے منت مانی کہ لڑکا پیدا ہو تو اسے کعبے کی نذر کر دوں گی، تاکہ وہ کعبہ کی خدمت کرے ۔ چنانچہ غوث پیدا ہوا اور شروع شروع میں وہ اپنے ماموؤں کے ساتھ کعبے کی خدمت کرتا رہا۔ پھر کعبے کی وجہ سے جو احترام اسے حاصل ہوا تو یہ لوگوں کو عرفہ سے گذارنے کا تحویل دار بن گیا۔'' صوفہ نام کی وجہ یہ ہے کہ ابھی یہ بچہ ہی تھا اور کعبے کی خدمت کیا کرتا تھا کہ ایک روز گرمی کی شدت کی وجہ سے گر پڑا۔ اس کی والدہ نے اسے گرا ہوا اور دبلا دیکھا تو کہا کہ میرا بیٹا تو سوکھ کر صوفہ (اون) بن گیا ہے ۔ لہٰذا صوفہ نام پڑا۔ اس کی اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے''[۵]

علامہ آلوسی کی نقل کردہ یہ روایت اگر کوئی تنہا روایت ہوتی تو شاید طویل بحث کا دروازہ کھول دیا

جاتا ۔لیکن اس روایت کے ساتھ جب ہم ان تمام روایات کا جائزہ لیتے ہیں جن کو پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے نقل فرمایا ہے، تو ایک روایت دوسری روایت کی گویا تصدیق کرتی نظر آتی ہے ۔

علامہ سکری نے اپنی تاریخ عرب میں یہ بھی لکھا ہے کہ صوفہ جریم کا ایک قبیلہ ہے جو مکے میں رہا کرتا تھا ۔عرفہ سے لوگوں کو گذارنے کا اختیار اسی کے پاس تھا ۔ انہوں نے قبل اسلام کے کسی شاعر کا ایک شعر بھی اسی قبیلے کے بارے میں لکھا ہے :

ولا یر تجون فی التعریف موفقھم حتی یقال اجیزوا آل صوفاناً

(ترجمہ)عرفات میں قیام کے وقت یہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے، جب تک نہ کہا جائے کہ اے آل صوفان لوگوں کو گذار دو۔

اگر امیر معاویہ سے منسوب شعر بھی درست مان لیا جائے، تو پھر اس بات میں بھی شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ اسلامی فقہ کو سب سے پہلے کتابی شکل ان لوگوں نے دی جو صوفی کہلاتے تھے، یعنی کتابی لٹریچر کی حد تک صوفیاء ہی قرآن و حدیث سے اخذ کئے جانے والے قوانین کے حامل تھے ۔ یہ بات یوں بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت علیؑ تک اکثر و بیشتر اکابر صوفیاء کے سلسلے پہنچتے ہیں اور حضرت کی ذات گرامی ایک طرف ان صحابہ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جو فقیہ تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دوسری طرف عوام وخواص ہی کو نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے اخص الخواص کو ان کی فقہی مہارت پر بھروسہ اور اعتماد تھا ۔ نیز ان کو اصحابِ صفہ کا سرگردہ بھی سمجھا جاتا ہے اور اصحابِ صفہ وہ جلیل القدر صحابہ تھے جنہوں نے خود کو زندگی کی دوسری ضروریات اور تقاضوں سے بے نیاز کر کے دین سیکھنے اور سکھانے کے لئے وقف کر رکھا تھا ۔

یہ بات ہمیں یقین سے معلوم نہیں ہے کہ اصحاب صفہ اور حضرت علیؑ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کو بھی صوفی کہہ کر پکارا گیا یا نہیں ۔ اموی اور عباسی خلافتوں کے طویل ادوار میں حضرت علیؑ سے تعلق رکھنے والے آثار مٹانے کی کوششیں کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا کیا تھا جس کا وجود اس زمانہ میں نہیں رہا ۔لیکن خانقاہ کی اصل سلسلے میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا اپنی مشہور کتاب عوارف المعارف میں یہ لکھنا اہمیت رکھتا ہے کہ دین سیکھنے کے لئے اور اسلامی مسائل کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے لوگ مدینہ منورہ آتے تھے ، ان کا قیام کا بعض صحابہ نے اپنے مکانوں پر انتظام کیا تھا۔ یہ انتظام غالباًاس لئے ہوا ہوگا کہ مسجد نبوی اور اصحابِ صفہ کی مختصر

نشست گاہ اور قیام گاہ باہر سے آنے والوں کے لئے کافی نہیں رہی ہوگی۔ مدینہ منورہ کے مذکورہ بالا مقدس مکانات ہی دراصل وہ مقامات تھے جہاں خانقاہ کہلانے والے ادارے کی بنیاد پڑی ۔ ان مکانوں کے مکینوں کو اس روایت کی بنا پر صوفی کہا گیا ہو تو کیا عجب ہے! جو روایت دینی سمجھ اور خدمت خلق کے سلسلے میں کعبۃ اللہ اور حضرت غوث عرف صوفہ یا صوفی اور آل صوفان سے قائم اور قدیم سے چلی آتی تھی ۔

تاہم اب ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ صفہ اور خانقاہ او ر اصحاب صفہ اور صوفیہ کا سنجوگ اور سنگم تاریخ کے کس لمحے میں اور ٹھیک کون سے مقام پر ہوا ۔لیکن اتنی بات ماننی پڑے گی کہ وہ بزرگان دین جن کو اسلام کی ظاہری جانکاری ہی نہیں، بلکہ باطنی کیفیات اور اثرات کا واقف کار بھی کہنا چاہیے ، وقت کے ساتھ تعداد میں بڑھ رہے تھے اور پھیل رہے تھے ۔ کچھ حضرت علیؑ کے ساتھ کوفے پہنچے ہوں گے تو کچھ ربذہ جیسے مقامات پر حضرت ابو ذر غفاریؓ کی طرح پہنچا دئے گئے ہوں گے اور قدرت اپنے حیرت انگیز انتظام کے ذریعے دریا سے نکلی ہوئی کتنی نہروں کو کہاں کہاں لے گئی ہوگی ۔ اسلام پیاسوں کو صرف یہ سوکھا درس دینے اور پڑھانے نہیں آیا تھا کہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی کیسا ہوتا ہے ۔ اسکی ماہیت کیا ہے ؟ بلکہ وہ تو پانی پلا کر بتاتا تھا کہ لو دیکھو پاک و صاف صحت بخش روح پرور پانی ایسا ہوتا ہے ۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے اوپر مذکور ہوئے اس قول کے یہی معنی نہیں تو اور کیا معنی ہیں کہ

''اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء خفی کو نہ سمجھ سکتا۔''

تصوف کی اصل کے بارے میں جو حوالے اوپر آئے ہیں ، وہ بہت قدیم حوالے ہیں۔جو حوالے اس زمانہ کے کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی اتنے قدیم ہیں اور اتنے زیادہ ہیں اور ایسے تسلسل کے ساتھ موجود ہیں کہ ان سے بھی صرف نظر کرنا درست نہیں ۔ یہاں ان حوالوں کا ذکر ضروری ہے اور نہ شاید ممکن ۔ تاہم آج سے چھ سات صدی قبل کے ایک نہایت ہی معتبر بزرگ حضرت شرف الدین یحیٰ منیری کے ایک مکتوب کا اقتباس بطور نمونہ از خردارے پیش کیا جاتا ہے ۔ حضرت اپنے اس مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :

سمجھو کہ تصوف کا ضابطہ اور قانون دیرینہ ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس پر پیغمبروں اور صدیقوں کا عمل رہا ہے ۔ بری عادتیں اور زمانے میں جو خرابیاں پیدا ہوگئیں ہیں ، ان کی وجہ سے

زمانے والوں کی آنکھوں میں صوفیوں کا حال برا دکھائی دیتا ہے ۔ ان کی پاک دامنی پر دھبّہ لگانے کا خاص سبب یہی ہے کہ خود صوفیوں نے اپنی روش بدل دی ہے ۔ اور خلاف اصول عادتوں میں مبتلا ہوکر تصوف کو بدنام کر دیا ہے ۔ ورنہ تصوف تو دین و ایمان کی جان ہے .....بہرحال اگر تصوف کی ابتدا پر غور کروگے تو اسکو آدم علیہ السلام کے وقت ہی سے پاؤگے ۔ اس عالم میں سب سے پہلے صوفی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا ۔ پھر اجتبا ء اور اصطفاء کے مقام پر پہنچایا ۔ خلافت عطا فرمائی ۔ پھر صوفی بنایا .....تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو منتقل ہوتی رہی ۔صوفیوں کا یہ بھی معمول ہے کہ کسی خاص جگہ بیٹھ کر آپس میں مل جل کر راز ونیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ صوفی اول آدم علیہ السلام کی اس خلوت در انجمن کے لئے خانہ کعبہ کی بنیاد پڑی ۔ یعنی دنیا میں پہلی خانقاہ کعبہ مکرم ہے .....پھر جب دور مبارک حضرت سید نا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آ پہنچا ،حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح کعبہ کا قصد کیا .....علاوہ اس کے خود مسجد نبوی میں ایک گوشہ معین کر دیا ۔ اصحاب گردہ جو سالکان راہ طریقت بعنوان خاص تھا .....ان میں بعض بوڑھے تھے، بعض جوان جیسے حضرت ابوبکر ، حضرت عمر ، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت معاذ و بلال و ابو ذر وعمار رضی اللہ عنہم ۔ ان حضرات کو خاص اوقات میں آپ وہاں بٹھاتے .....اس خاص جماعت صوفیہ کے لوگ قریب قریب ستر اشخاص تھے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت وتکریم فرماتے تو ان کو ردائے مبارک یا اپنا پیرا ہن شریف عنایت فرماتے۔صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا ۔اب تم جان سکتے ہو کہ تصوف اور طریقت کی اول اول ابتدا حضرت آدم علیہ اسلام سے ہوئی،۔ے

حضرت یحیٰ علیہ السلام منیری کا شمار ان عظیم المرتبت بزرگوں میں کیا جاتا ہے جن میں حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ ، حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ ۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ،حضرت بہار الدین نقشبندیؒ جیسی خدا معلوم کتنی بے مثال ہستیاں ہیں، جو ایک طرف اعلیٰ ترین روحانی مقام کی مالک ہیں اور دوسری طرف علمی دنیا میں جو اونچی سے اونچی جگہ ہوسکتی ہے۔ وہاں متمکن نظر آتی ہیں ۔ اگر ان حضرات نے بالکل ابتدائی زمانے کے راویان حدیث کا زمانہ پایا ہوتا تو ان کی ہر روایت کو بھی ایسا ہی معتبر سمجھا جاتا ، جیسا کہ دوسرے راویان حدیث کے اعتبار نے مسلمانوں کے نزدیک ہی نہیں پوری علمی دنیا کے نزدیک مکمل ترین اور بالکل صحیح سند کی حیثیت اختیار

کرلی ہے۔ کتابی حوالے بھی ان کے زمانے تک ایسے موجود تھے، جو امتداد زمانہ اور انقلابات کے سبب اب ہم کو میسر نہیں ہیں ۔ ان حضرات کا اپنے پیران سلسلہ کے شجروں اور اسناد کو پیغمبرآخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچانا بھی ایک بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ تصوف کی اصل کا خود پیغمبر اسلامؐ تک ہونا بالکل یقینی نہیں ۔

یہ سارا مستند تاریخی مواد لفظ ''صوفی'' کی قدامت کو ثابت کرنے والا مواد ہے، لیکن اس اصرار کی حاجت غالباً کسی کو بھی نہیں کہ جو لوگ بالکل سامنے کی چیز کو ماننے سے انکار کریں ۔ ان سے اس چیز کا وجود منوا ہی لیا جائے ۔ کیونکہ محض کاغذی بحث اور بحث برائے بحث کچھ خاص مفید مشغلہ نہیں ہے۔ کارآمد اور فیض پہنچانے والی چیز یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ صوفی کہلانے والے کس چیز کے علمبردار رہے ہیں؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ان میں سے ایک بھی معتبر آدمی شریعت کا سخت پابند نہیں! کیا وہ سند قرآن و حدیث کے سوا کسی اور چیز سے لیتے ہیں؟ کیا انہوں نے حضرت ابو ہاشم کوفیؒ کی طرح دین کی باریکیوں اور نزاکتوں اور معنی ومفہوم کو جسم و روح کے ساتھ نہیں سمجھا ؟

غالباً کوئی بھی اہل علم اور حق پسند صوفیہ کی دینی خدمات کا منکر نہیں ہے ۔ انکار کرنا کیسا جو لوگ واقعی سچ کا ساتھ دینیوالے ہیں، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اہل تصوف نے اسلام کے پورے فیوض و برکات کو صرف مسلمانوں تک ہی نہیں پہنچایا بلکہ ان غیرمسلموں کو بھی اس سے بہرہ مند کیا، جو اسلام سے بے حد وحشت کرتے تھے اور دور بھاگتے تھے اور یہ بات نہیں مانتے تھے کہ اسلامی تعلیمات میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جن سے غیرمسلم بھائی مسلمان نہ ہوکر بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ کل بنی نوع انسان ، اپنے پرائے سب ہی کے لئے ہیں۔ یہی حضرات ہیں، جنہوں نے حضرت ابو ہاشم کوفیؒ کی طرح اسلام کی آدھی ادھوری تعلیم کو نہیں بلکہ اسکی پوری فرمانردائی کو جانا اور اسلام کے فیض بخش دریرے میں انسان کو لے کر آئے ۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اس ارشاد کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے :

''ایک طاعت لازمی ہے اور ایک طاعت ہے متعدی ۔ طاعت لازمی وہ ہے، جس کا فائدہ اسی ایک طاعت کرنے والے کی ذات کو پہنچتا ہے۔ اور وہ نماز اور روزہ ہے، اور حج ہے اور اوراد وتسبیحات اور اسی طرح کی اور چیزیں ہیں ۔لیکن طاعت متعدی وہ ہے کہ جس سے فائدہ اور راحت دوسرے کو پہنچے ، خرچ کرنے اور زشفقت برتنے سے اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کے حق میں مہربانی کرنے

سے ۔ اس کو طاعت متعدیہ کہتے ہیں ۔ اور اس کا ثواب بے حد و بے اندازہ ہے اور طاعت لازمہ ہے تو اخلاص ہونا چاہیے، تاکہ قبول ہو جائے۔ لیکن طاعت متعدیہ تو جس طرح کی بھی ہو اور جیسے بھی کی جائے، اس کا ثواب ہے''۔[۸]

حضرت نے اپنے ارشاد کے آخر میں جو فقرہ استعمال فرمایا ہے وہ ایک ایسے نکتے کی طرف لے جاتا ہے، جو اسلامی انقلاب کی اصل روح ہے یعنی خدمتِ خلق جس طرح بھی ہو مفید ہے ۔ مثلاً اگر کوئی دکھاوے کے لئے کھانا کھلائے یا کسی ننگے کو کپڑے پہنائے ،تب بھی اتنا ثواب تو نیکی کرنے والے کو مل ہی جائے گا کہ بھوکے کا پیٹ بھرا ، ننگے کا تن ڈھکا ۔ یہ اسلام کی تعلیمات کا وہی رخ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس سے اپنے پرائے سب مستفید ہو سکتے ہیں ۔ اور مستفید ہوتے آئے ہیں ۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ عہد رسالت میں سب مسلمان صوفی کیوں نہ کہلائے ۔ کم از کم مسلمان علماء اور مبلغوں کو تو صوفی نام ہی سے پکارا جانا چاہیے تھا! تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت بلکہ آج تک سب سے بڑا شرف صحابیت ہی کو سمجھا جاتا رہا ہے ۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑے اللہ والے بزرگ سے ایک عام صحابی کو افضل جانا گیا ۔ اہل بیت اطہارؑ کی فضیلت کا بھی ایک پہلو یہ ہے کہ وہ نہ صرف شارع علیہ السلام کا گوشت پوست ہیں اور ان کی رگوں میں نبوت کا پاک خون گردش کر رہا ہے، بلکہ انہوں نے ہر وقت خلوت میں ساتھ رہ کر صحبت کا سب سے زیادہ فیض پایا۔ اگر صحابیت کی بھی درجہ بندی ممکن ہو تو ان کو اعلیٰ ترین صحابی یا صحابیہ ماننا چاہیے ۔ دین کا جیتا جاگتا نمونہ ۔ بلکہ خود چلتا پھرتا دین ، اس کا مکمل ترین روپ ، اسکی ساری کی ساری تابانی مخصوص اوقات میں نہیں بلکہ ہر وقت ان کی ایسی آنکھوں کے سامنے رہی جو مازاغ البصر و ما طغے (نگاہ نہ تو ہٹی نہ بڑھی) کی جانشین آنکھیں تھیں اور تجلیٰ دیدار کی سمائی اور سہارا رکھتی تھیں ۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ظاہر بین حضرات نے نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر بقول حضرت یحیٰی منیریؒ سب صوفیوں سے بدظن ہو جانا ضروری سمجھ لیا ۔ حالانکہ سچے صوفی تو وہ ہیں، جنہوں نے سند اور سنت کو صرف کتابی حوالے تک محدود نہیں رکھا ۔ اس کی عملی سند تسلسل اور تواتر کی سند ، ظاہر و باطن کی سند ، ہر طرح کی سند کو لازم جانا ،یعنی ان کے یہاں یہ پابندی رہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پیر کا مرید ہوتا ہے تو پہلے یہ دیکھے کہ اس پیر کے پاس اس کے اپنے پیر کی صحیح اور درست سند ہے یا نہیں ؟ یہاں

تک کہ یہ سند ہاتھ در ہاتھ نیچے سے اوپر کی طرف جاتے ہوئے تبع تابعینؒ ،ان سے اوپر تابعینؒ ان سے اوپر صحابہ کرام اور پھر خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ہوتی ہے یا نہیں ؟ کو صوفیاء ان ساری کڑیوں ایک دوسرے سے جڑا ہونا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اگر ایک کڑی بھی ٹوٹی ہوئی ہے یا مشتبہ تو پھر پورے سلسلے کے بارے میں تحقیق شروع ہو جاتی ہے ۔ اہل تصوف پیر کے لقاء اور صحبت کو چاہے وہ خط کے ذریعے اور غائبانہ اس بیعت کی طرح ہو جیسی غائبانہ بیعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت حضرت عثمانؓ سے خود اپنے دست مبارک پر اپنا دوسرا دست مبارک رکھ کر قبول فرمائی یا عام بیعت کے طریقے کی بیعت ہو ۔ بے حد ضروری خیال کرتے ہیں ۔ پیر کی صحبت کو سب سے زیادہ مفید مانا جاتا ہے۔ یہ صحبت سنت کی تعمیل، اور تابع داری کے لیے بھی ہوتی ہے اور اس معنویت تک پہنچنے کے لیے بھی کہ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہارؑ نے بھی قرآن پڑھنے کے ساتھ قرآں لانے والے کے مصحف رخ کو سدا سامنے رکھا تھا۔ اور مبارک قدموں سے لے کر چشم وابرد کے ارشادات تک روز کی زندگی میں رہنما بنایا تھا۔ ایسے لوگ بدعت کو اختیار کرنا کیسا اس کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی اپنے پاس نہیں رکھتے۔ ان کے خیال میں تو کتاب وسنت کا دائرہ اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہے کہ اگر کسی کو ایک طویل زندگی بھی مل جائے تو شاید ان ۶۳/ مبارک سالوں کی پوری پیروی کا حق ادا نہ کر سکے جو سب ہی کے لیے جنم مرن کے ساتھی اور رہنما سال ہیں! معجزاتِ نبویؐ میں سے یقیناً ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ ۶۳/سال نے ازل سے ابد تک کا احاطہ کرلیا۔

''مٹام'' مٹی کے اس چھوٹے سے مینار کو کہتے ہیں، جو کسی علاقے سے مٹی کھودتے اور ہٹاتے وقت مزدور اور کنٹریکٹر بغیر کھودے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ بعد میں پیائش کر کے معلوم کیا جاسکے کہ پرانی مٹی کا ڈھیر کتنی اونچائی تک تھا اور کتنی مٹی کھود کر نکالی جاچکی ہے۔ اسلام کے مٹام صوفی حضرات کے طریقے کو اگر لوگوں نے تصوف کے نام سے یاد کیا تو کچھ غلط نہیں کیا ۔ اگر ان حضرات کی شہرت صوفی کی جگہ کسی اور نام سے ہوتی،تب بھی پرانے اور اصلی اور پورے اسلام کی تلاش میں لوگ انہیں کے پاس آتے۔

اصلی تعلیمات کے مطابق علاّم کو ایک ٹھوس حقیقت جانتے ہیں۔ اگر صوفیوں کی کچھ باتیں سنت، مہاتماؤں اور بعض دوسری تعلیمات سے میل کھاتی ہیں، تو اس پر حیرت کیوں ہو کہ ہم سب انسانوں کا کھانا، پینا، سونا، جاگنا،زندگی کی ساری ضروریات بھی تو مشترک ہی ہیں۔ اور اسلام نے تو

یہ دعویٰ کبھی کیا ہی نہیں کہ وہ کوئی الگ تھلگ یا نیا مذہب ہے۔ اس نے تو جب کہا یہی کہا کہ پیغمبر آخرزماںؐ سے پہلے اللہ کے جتنے نبی اور پیغمبر آئے، وہ سب برحق تھے۔ ان کی تعلیمات بھی حق تھیں، امتداد زمانہ سے کم ہوگئیں یا بڑھ گئیں، یا بدل گئیں اس لیے اصلی اور پوری تعلیم آخری نبی لائے۔ تاہم یہ بات مان کر چلا جائے تو مضائقہ ہی کیا ہے کہ گھٹ جانے، بڑھ جانے یا بدل جانے کے بعد بھی سابق کے سچے پیغامات میں کچھ نہ کچھ تو اصل بچا ہوگا؟ بس وہی ہم میں اور ان میں مشترک ہے۔ اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

تصوفِ اسلامی کی جتنی بھی تعریفیں اب تک کی گئی ہیں، وہ کم وبیش محدود تعریفیں ہیں۔ یہاں ان کو دہرانا تحصیل حاصل جیسا ہوگا، کیوں کہ یہ تعریفیں عام طور پر دستیاب کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ان میں سے شاید کسی تعریف میں بھی تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے کا پورا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ اس طرح کی کسی تعریف میں تصوف کی پوری سمائی ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیوں کہ اسلامی تصوف کا تعلق بھی ہندوستان کے قدیم فلسفوں اور تصورات کی طرح ''حد'' --- ''بے حد'' اور--''ان حد'' سب سے ہے۔ لفظی تعریف کوئی بھی ہو وہ ''حد'' تک تو جاسکتی ہے، لیکن ''بے حد'' اور ''ان حد'' تک اس کی پوری رسائی ممکن نہیں ہے، کیونکہ لفظوں کی تراش خراش میں وقت نے صدیاں ہی کیوں نہ بتائی ہوں۔ لفظ بہر حال محدود ہوتے ہیں۔ اصطلاحیں ،لفظوں کے معنی وسیع اور مخصوص کرنے کے لیے ایجاد اور وضع کی جاتی ہیں لیکن ان کی پہنچ بھی تیر کے روایتی فاصلے کی طرح ناپی جاسکتی ہے اور بس: جبکہ وہ ذات پاک جس کا ذکر منظور ہے، لامحدود ہے اور ایسی ہے کہ اس جیسا اور کوئی ہے ہی نہیں!

لیس کمثلہ شئٌ

اگر ہم صوفیوں سے منسوب عقیدۂ وحدت الوجود کے قائل نہ بھی ہوں، تب بھی اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ مذہب اب سے ہزاروں ہزار سال پہلے یہ حقیقت دریافت کرچکا تھا کہ جو کچھ موجود ہے وہ لامحدود ہے ، ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کوئی نہایت، اور کوئی چھور نہیں۔ نہ اس کی ابتدا کو ناپا جاسکتا ہے، نہ انتہا کو۔

مذہب کی یہ دریافت کوئی معمولی دریافت نہیں ہے۔ اس دریافت نے ہماری زندگی اور اس کی تگ دو اس کے سفر کو ختم نہیں ہونے دیا بلکہ، جاری رکھا ہے۔ جن لوگوں نے مذہب کو ایک نشہ کہا،

ایک افیون قراردیا، وہ اپنے عارضی اقتدار کے نشے میں اس بات کو فراموش کر بیٹھے۔ اور اپنی ''حدوں'' کے حصار میں ایسے جکڑ بند ہوئے کہ اتنی بات بھی ان کے سامنے نہ آئی کہ آدمی کا سائنسی رویۂ اور سدا کھوج میں لگے رہنا دراصل مذہب کی اسی دریافت کا نتیجہ تھا، جس نے پہلے دن شے بتا رکھا ہے کہ جو کچھ موجود ہے، وہ لامحدود اور اس کے امکانات ناقابل شمار ہیں۔ چنانچہ ہماری جدو جہد کتنی ہی بڑھ جائے، اس جدو جہد کا نتیجہ ہمیں کتنا ہی کامیاب نہ کردے، عشق کے امتحانوں اور نئے آسمانوں کی دریافت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، یعنی تلاش کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ حسرت ناکام آرزو کو کہتے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ نے حسرت کو زندگی کا جوہر اسی لیے کہا تھا کہ اگر سب کچھ مل جائے تو آدمی مطمئن ہوکر بیٹھ جائے۔ حضرت خواجہ میر درد نے شاید اسی کیفیت کو اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے:

مجھ سے مایوس ہزاروں ہیں تصدّق تجھ پر
تو سلامت رہے، تجھ سے ہے تمنا باقی

بعض ستم ظریف کرم فرما صوفیوں کو قنوطی یاس پسند اپاہج بنا دینے والا کہتے ہیں۔ کاش انہوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک پر آنے والا یہ مصرع بھی سنا ہوتا:

مرداں ہزار دریا خوردند و تشنہ رفتند

یعنی لوگ ہزار سمندر پی جانے کے باوجود پیاسے چلے گئے) یہ ارشاد گرامی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اشرف المخلوقات آدمی کی زندگی میں Saturation Point کبھی نہیں آتا۔ متلاشی کو تلاش کا پھل اور پیاسوں کو کوزہ بھر پانی نہیں، دریا اور سمندر ملے چلے جاتے ہیں۔

سالک کا سلوک بھی ایک کھوجی کی کھوج ہوتا ہے۔ اور اگر آپ مجھے ایک نیا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دیں، تو عرض کروں کہ سالک بھی ایک سائنٹسٹ ہی ہے۔ مگر وہ سائنٹسٹ جو اپنی تحقیق اور دریافت کو مادّی عالم سے آگے بڑھا کر عالم غیب، روحانی دنیا تک بھی پہنچاتا ہے۔

عالم ناسوت، یعنی ہمارا یہ آنے والا عالم، مادّی دنیا، ایک حد کی دنیا بظاہر دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے روحانی مسافروں یعنی صوفیاء اور سالکوں نے بتایا ہے کہ ''حد'' سے آگے ایک چیز ''بے حد'' بھی ہے۔ اور اس سے بھی آگے ایک اور ہی چیز ''ان حد یعنی لامحدود'' بھی!

جس طرح ہم ''حد'' سے ''بے حد'' اور ''ان حد'' کی طرف جاتے ہیں، یعنی محدود سے لامحدود کی طرف، معلوم سے نامعلوم کی جانب اور سمجھتے ہیں کہ راستہ بس سامنے کا، آگے کا کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ''حد'' اور ''بے حد'' اور ''ان حد'' کی کیفیت ان منزلوں کی بھی ہے جن کو ہم نے بظاہر سر کیا ہوا سمجھ لیا تھا اور جنہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے، یعنی راستہ جس طرح آگے کی راہ میں لامحدود تھا، اسی طرح پیچھے کے رخ جدھر سے ہم آرہے ہیں، اس جانب بھی لامحدود ہے۔ بلکہ دائیں طرف اور بائیں طرف اور اوپر اور نیچے، ہر جہت میں ۔ ہر سمت میں جو کچھ ہے، بس لامحدود ہی ہے، یعنی جن منزلوں کو ہم پایا ہوا اور سر کیا ہوا سمجھتے رہے ہیں، وہ بھی حقیقت میں پوری طرح اور واقعی پائی ہوئی منزلیں نہیں ہیں۔ ان سے واقفیت، ان کی جانکاری محدود ہی ہے۔ ان کے سارے امکانات سے کما حقہ، باخبر نہیں ہوئے، اس لیے آگے بڑھنے کے ساتھ واپس آتے رہنا بھی ضروری ہے، یعنی راستے کی ابتدائی درمیانی یا آگے کی جس منزل پر بھی ہم کھڑے ہوتے ہیں خود اسی مقامی اور بظاہر چھوٹی سی جگہ کے امکانات بھی لامحدود اور قطعی ان گنت اور بے شمار ہوتے ہیں۔ گویا بڑائی، بزرگی، عظمت، کمال اور کامیابی چھوٹی چیز سے بڑی چیز کی طرف جانے ہی میں نہیں ہے، بلکہ بڑی چیز سے چھوٹی چیز کی طرف آنے میں بھی ہے۔ قطرہ، سمندر، ذرّہ، پہاڑ اور کرن بھی آفتاب ہیں۔ اگلے وقتوں میں یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ اس ایٹمی دور نے اس بات کو سمجھنا آسان کردیا ہے۔ لوگ اس مشہور بات سے بھی خوب واقف ہوگئے ہیں کہ دور بین ہی نہیں، خورد بین بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ دریا کے فوائد کی عمومیت نہروں، نالیوں پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں سے، پہاڑوں کی افادیت ان کی ٹوٹنے چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بننے سے اور آفتاب اور سورج کا فیض اس کی شعاعوں اور کرنوں سے عام ہوتا ہے۔

ان لامحدود عالموں اور کیفیات کو پیدا کرنے والا خالق خود کیسا بے مثال اور ہمارے خیال اور گمان سے ماوراء ہے۔ اس کا بھی اندازہ لگانا ممکن بات نہیں ہے۔ لیکن یہ دریافت بھی مذہب ہی کی دریافت ہے۔ اور بڑی اہم دریافت ہے کہ اس بے مثل ذات یعنی حق کو اس کی مخلوق ہی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ وہ زمان ومکان (Time and Space) سے بے نیاز ہے، لیکن ہر جگہ موجود بھی ہے۔ اگر ہم اس کی مخلوق، پیدا کی ہوئی کائنات یا کائناتوں میں اس کا ادراک نہ کرسکیں اور صرف خلق کو دیکھتے رہیں، خالق کو نہ دیکھیں اور حق کو اس خلق کا غیر سمجھیں، تو اس کو صوفیوں کی اصطلاح میں

فرق کہا جاسکتا ہے اور اس کے مقابلے میں جمع آتا ہے، یعنی سالک، حق کا متلاشی، خدا کی راہ چلنے والا حق کو دیکھے، حق کا مشاہدہ کرے اور خلق اس کی نظر سے غائب ہوجائے۔ اس طرح خود حق خلق کا حجاب ہوجاتا ہے۔ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور پورے تیاگ کے ساتھ یعنی راہب سابن کر اس ایک ذات پاک میں محو رہے تو وہ فنا کا مرتبہ تو حاصل کرلیتا ہے، کہنے والے اسکو فنافی اللہ بھی کہتے ہیں، لیکن ایک بات اس کے سوا اور بھی ہے اوروہ یہ کہ خلق کو حق کے ساتھ اسی طرح دیکھا جائے کہ حق کا مشاہدہ تمام موجودات میں ہو اور یہ دیکھا جائے کہ حق ہر جگہ ایک علیحدہ صفت اور ایک الگ شان کے ساتھ ظاہر ہواہے۔ یہ جمع الجمع ہے اور یہ مقام بقا باللہ کا ہے۔ اس سے اونچا اور کوئی مقام نہیں۔ کیوں کہ اس میں جو شئے جیسی ہے، ویسی ہی نظر آتی ہے۔ سائنٹفک اصول بھی شاید یہی چاہتے ہیں کہ جو چیز جیسی ہے اس کو ہم اسکی اپنی اصلی کیفیت اور حالت میں جان لیں۔ روحانی اصطلاح میں یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ سالک وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں دیکھتا ہے، اس طرح کہ نہ خلق، حق کا حجاب ہوتی ہے اور نہ حق خلق کا حجاب ہوتا ہے۔

چشتی نظامی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے فرمایا ہے کہ کمال یہ ہے کہ آدمی سرحدفنافی اللہ پر پہنچ کر خدا کی بقا سے باقی ہوجائے۔ پہلی سیر (فنا فی اللہ) کو سیر الی اللہ اور دوسری سیر (بقابا اللہ کوسیر فی اللہ) کہتے ہیں پہلی سیر کی انتہا ہے۔ دوسری سیر کی کوئی انتہا نہیں!

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کہتے ہیں کہ انبیاء کو علیحدہ کرکے واصلوں یعنی خدا تک پہنچے ہوئے لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک مشائخ صوفیاء جنہوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری اتباع اورتقلید سے وصول کا مرتبہ حاصل کیا اور اسکے بعد انہیں مخلوق کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔ یہ لوگ کامل اور مکمل (مکمل کرنے والے) کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ فضل وعنایت ازلی سے عین جمع وتوحید کے دریا میں ڈوب جانے کے بعد تفرقے کے ساحل پر نکلتے ہیں اور فنا کے بعد انہوں نے بقا حاصل کی ہے، تاکہ خلق کو نجات کا راستہ بتائیں اور بلند درجات تک پہنچائیں۔ دوسرا گروہ ان واصلین کا ہے جو واصل ہونے کے بعد اس عالم کی طرف لوٹ کرنہیں آئے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ تک نہ پہنچے۔

شاید اسی نظریئے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کو غلط فہمی ہوئی اور وہ تصوف کو اپنے تصوف خودی کے خلاف سمجھ بیٹھے۔ غالباً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے

یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی اور وہ دوبارہ انسانوں کے درمیان زمین پر واپس آ گئے۔ اگر مجھے معراج ہوتی تو میں واپس نہ آتا۔''

اگر یہ بات حضرت گنگوہی سے منسوب نہ ہو، کسی اور صوفی سے منسوب کی جائے اور اس کو بحث کی خاطر درست بھی تسلیم کرلیا جائے، تو اس کی تاویل بھی کی جاسکے گی کہ یہ ایک صوفی کا ذاتی تجربہ اور ذاتی پسند اور ترجیح کی بات ہوسکتی ہے کہ وہ راہ سلوک کے ایک درمیانی مقام اور منزل کے لطف اور آنند کو پسند کرے اور وہیں پڑا رہنے کی سوچے۔ لیکن سلوک سے واقفیت تو یہی ظاہر کرتی ہے کہ اس طرح کی کیفیت ایک درمیانی اور بیچ کی منزل کی کیفیت ہے۔ منزلیں اس سے آگے اور بھی ہوتی ہیں۔ اور کامل لوگ ان سب کو سر کرنے اور ہر منزل پر پہنچ جانے کے باوجود پھر واپس ہوتے ہیں اور پلٹتے ہیں کہ اپنے کام کو پورا کریں۔ انبیاء کا درجہ اولیاء سے بلند اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ خدا رسیدہ ہونے کے باوجود خدا کی مخلوق کی ہدایت اور رہنمائی میں کوشاں رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بہت لوگوں کو خلافت عطا فرمائی۔ ان کا ایک خلافت نامہ جو انہوں نے حضرت خواجہ شمس الدین یحییٰ کو دیا تھا اور صاحبِ سیر الاولیاء امیر خورد کرمانی علیہ الرحمہ کی مہربانی سے ہم تک پہنچا ہے، اس میں حضرت خواجہ نے تلقین کی بنیاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث شریف کو بنایا ہے:

والّذی نفس محمد بیدہ لئن شئتم لا قسمن لکم ان احبّ عباد اللّٰہ الی اللّٰہ الّذین یحبّون اللّٰہ الی عباد اللّٰہ ویحبّون اللّٰہ الی اللّٰہ۔

ترجمہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر تم چاہو تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بندگان خدا میں سب سے زیادہ خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جو خدا کو دوست رکھتے ہیں، اس کے بندوں کے ذریعے اور جو بندگانِ خدا کو دوست رکھتے ہیں خدا کے واسطے!

ہندوستان کی قدیم روحانی تعلیم میں جس چیز کو کرم مارگ کہا جاتا ہے، وہ بھی شاید اسی طرح کی ایک بات ہے۔

مسلمان صوفیاء کے نزدیک عالم ایک ٹھوس حقیقت ہے، عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہیں۔ قرآن کا فرمان بھی یہی ہے کہ موجوداتِ خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں، زمانی ہوں یا مکانی،

سب کی حقیقت اللہ ہی ہے!

هو الاوّل والآخر والظّاهر والباطن

لا الٰہ کا مطلب صوفیاء کے اس گروہ کے نزدیک جس سے میں وابستہ ہوں، یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود ہے اور نہ موجود!

اللّٰه نورالسّموٰات والارض ہے، یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور نور کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ النور هوا لظّهور، والظّهورهو الموجود! نور کے معنی ظہور ہیں اور ظہور اور وجود ایک ہے۔ وہی ایک ذات ہر شئے کو محیط ہے۔ ہر روپ اس کا روپ ہے۔ ہر شان اس کی شان ہے۔ جو کچھ دیکھو اس سے دیکھو، اس میں دیکھو اور اسکی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کرو!

خدا کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کرنا، نہ قرآن کے خلاف ہے، نہ حدیث کے درس سے ہٹی ہوئی کوئی چیز! قرآن نے بار بار کائنات میں غور کرنے اور دنیا کی سیر کی دعوت دی ہے۔ یہ سیر سیر الیٰ الارض یا الی السّماء زمین اور آسمان کی سیر نہیں حقیقت میں سیر الیٰ اللہ ہے۔ یہ اسلام ہے، یہ تصوف ہے۔

مگر کون سا اسلام؟ تصوف کے وابستگان سے زیادہ کس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ تصوف اسلام کی ظاہری تعلیم سے علیحدہ کسی اور خفیہ یا کسی حسن بن صباحی باطنی تعلیم کا نام ہرگز نہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے خود اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا ہے:

'' حضرت خضریؒ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ بغیر شرعی عذر کے ختم ہوجائیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں احکام شریعت کے ساقط ہونے کا قائل کیسے ہوسکتا ہوں؟ ہمارے شیخ روز بہان سے مصر میں کئی بار کہا گیا کہ آپ نماز چھوڑ دیں کہ اس کی آپ کو ضرورت نہیں، فرمایا کہ مجھ میں نماز چھوڑنے کی طاقت نہیں ..... میں نے بعض طریقت کے جاہلوں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے نماز ترک کردی ہے، وہ کہتے ہیں کہ سالک کے لیے واجب ہے کہ ہر وقت نماز میں رہے۔ لیکن ان بے چاروں کو معلوم نہیں کہ نماز کے بھی جسم اور روح دونوں ہوتے ہیں۔ اس کا جسم ارکانِ نماز میں اور اس کی روح حضور قلب ہے جس طرح ہم روح کو انسان نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ مجموعی انسان کا حصہ ہے، اس طرح نماز کی بھی روح ہے، لیکن جب تک روح کا تعلق قالب (جسم) سے باقی ہے، واجب ہے کہ قالب کی زینت ارکان نماز سے اور روح کی زینت حضور

قلب سے رہے!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خواجہ ابو المویدؒ نے اپنے والد سے پوچھا کہ العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) سے کون سے علماء مراد ہیں؟ فرمایا یہی علماء جنہیں تم دیکھ رہے ہو!

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء نے حضرت ابوسلیمان رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی نقل فرمایا ہے کہ جو کہتے تھے جو بات بھی میرے دل پر گزرتی ہے میں اسے قبول نہیں کرتا، جب تک کہ دو گواہ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ اس پر گواہی نہ دیں۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے جانشین اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پیر و مرشد حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی نور اللہ مرقدہ نے اسی تلقین کو بنیاد بنا کر اعلان فرمایا تھا کہ اصل حجت کتاب وسنت ہیں۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، حضرت کے اس ارشاد نے جاہل پیروں کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دیا!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک اور بڑے بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے بارے میں اس احتیاط کے ساتھ روایت بیان کی کہ:

''میں نے سنا ہے اور ذمہ داری روایت کرنے والے پر ہے کہ ایک روز حضرت شیخ زکریا ملتانی قاضی قطب الدین کاشانیؒ کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ قاضی صاحب صبح کی نماز کی امامت کررہے تھے۔ ایک رکعت پڑھ چکے تھے۔ شیخ دوسری رکعت میں پہنچے اور شریک ہوگئے۔ جب قاضی قطب الدین التحیات میں بیٹھے تو اس سے پہلے کہ سلام پھیریں، شیخ بہاء الدین کھڑے ہوگئے اور اپنی نماز پوری کی۔ جب نماز سے فارغ ہوگئے، تو قاضی قطب الدین نے شیخ سے کہا کہ نماز کے سلام سے پہلے کیوں کھڑے ہوگئے۔ ممکن تھا کہ امام سے سہو ہوا ہوتا اور وہ سجدہ سہو کرتا۔ جب آپ سلام سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے، تو سجدہ سہو نہیں کرسکتے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر کسی کو نور باطن سے معلوم ہوجائے کہ امام سے کوئی سہو نہیں ہوا ہے، تو اس کا کھڑا ہوجانا جائز ہے۔ قاضی قطب الدین بولے کہ ہر وہ نور جو شرع کے موافق نہ ہو وہ ظلمت (اندھیرا) ہے!

حضرت سلطان المشائخ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ سالک ترقی کرکے طریقت تک پہنچتا ہے اور طریقت سے ترقی کرکے حقیقت تک رسائی پاتا ہے۔ اگر حقیقت کا اعلیٰ مقام ملنے کے بعد اس سے کوئی بھول چوک ہوجائے، تو اسے revert کیا جاتا ہے اور حقیقت سے نچلے مقام طریقت میں

ڈال دیتے ہیں اور وہاں بھی کوئی گناہ اور غلطی ہوجائے تو اس سے نچلے درجے شریعت میں پہنچا دیتے ہیں، لیکن شریعت کے گناہ اور غلطی کا خمیازہ دوزخ کے گڑھے کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے، کیوں کہ شریعت کے نیچے اس گڑھے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ احتیاط شریعت کی حفاظت میں ضروری ہے۔

شریعت کو چھوڑنا دوزخ کو دعوت دیناہی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ رسولؐ کی نعوذ باللہ دشمنی مول لینا ہے اور ہر شخص کو کیا صوفی اور کیا غیر صوفی اس سے پناہ مانگنی چاہیے اور جب صورتِ حال یہ ہوتو تصوف کی تاریخ بھی اس تاریخ سے مختلف کوئی تاریخ نہیں ہوسکتی جس کو اسلام کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کا بیان اگر تصوف اور اہل تصوف کے ذکر کے بغیر ہوتو کوئی بھی ذی ہوش اور معمولی سا علم رکھنے والا بھی اسے اسلام کی اور مسلمانوں کی پوری تاریخ ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ اس لیے جس طرح خدا کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کی جاتی ہے، تاریخ تصوف کی تلاش بھی اسلامی تاریخ کے بڑے دائرے کے اندر رہ کرکرنی چاہیے، لیکن اسے کوئی علیحدہ فرقہ مان کر نہیں کہ اسلام اور اس کا حقیقی روپ ''تصوف'' کسی بھی فرقہ بندی کا قائل نہیں، بلکہ اہل تصوف ہی وہ مسلمان ہیں جو نہ اپنے آپ کو کسی خانے اور ڈبے میں بند رکھنے میں یقین رکھتے، نہ کسی اور کو کال کوٹھری میں ڈال کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جو آنکھیں آنکھ والوں کو دیکھنے کی عادی رہی ہیں، ان کی بصیرت اور بصارت بشری حد بندیوں کے باوجود دور بینوں سے زیادہ دیکھتی ہیں اور جہاں تک دیکھتی ہیں، وہیں تک اپنے اور دوسروں کے دائرہ عمل کو وسیع رکھنا چاہتی ہیں۔ جس کو یقین نہ آئے وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ کا واقعہ پڑھے کہ جب حضرتؒ کو ایک حجرے سے زنجیر کھڑکنے کی آواز آئی تو انہوں نے چونک کر پوچھا کہ یہ زنجیر کی آواز کیسی ہے؟ خادموں نے عرض کیا کہ کسی نے لنگر کے خزانے سے قرض لیا تھا۔ وعدے کے مطابق واپس نہیں کیا۔ اسلئے منتظمین نے اس زمانے کے دستور کے موافق اس کو حجرے میں قید کردیاہے۔ حضرت سخت ناراض ہوئے اور اسی وقت اس قرضدار کو یہ کہتے ہوئے آزاد کرایا کہ قرض کہتے کسے ہیں؟ مال سب اللہ کا ہے۔ کچھ میں کھاتا ہوں، کچھ تم لوگ کھاتے ہو۔ کچھ اس بے چارے نے کھالیا۔ کون سا غضب ہوگیا؟ خبردار! آئندہ خانقاہ میں ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے۔

فیاء نے روزمرہ کی زندگی کے معاملات ہی میں وسیع النظری سے کام نہیں لیا، ذیلی اور ضمنی فقہی

اختلافات کو بنیادی باتیں بنا کر فساد پھیلانے والوں سے بھی بچتے رہے اور جہاں تک ہوسکا رعایت اور رخصت کے مسنون طریقے سے کام لیا۔ اسی لیے اسلامی تاریخ کے بڑے کینوس پر صوفیاء کو ان کے حریفوں اور مخالفوں کے سامنے رکھ کر دیکھنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے کہ چیزیں Contrast اور ضد سے بھی پہچانی جاتی ہیں: نیز تصوف کی تاریخ کا مطالعہ اسلامی تاریخ کے تحت بہت سے ذیلی عنوانوں کے تحت کیا جاسکتا ہے۔ مثلا یہ کہ صوفیا نے اسلام کو کس طرح سمجھا، کس طرح سمجھایا، اسلام کو پھیلانے میں کتنا حصہ لیا، تبلیغ کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے؟ انہوں نے مسجد کے ہوتے ہوئے خانقاہ کیوں بنائی، مسجد ہی کو خانقاہ کی حیثیت سے کیوں نہ استعمال کرتے رہے۔ اس سے کیا فائدہ یا کیا نقصان ہوا؟ مختلف سلسلوں کی داغ بیل کس طرح پڑی ؟ ان سلسلوں کی ضرورت اور معنویت کیا رہی؟ غرض کہ بے شمار عنوانات کے تحت اس تاریخ کا مطالعہ ہوسکتا ہے۔

اس تاریخ کے مطالعے کے دوران حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ خانقاہ پر معترض ہونے والے بہت آسانی سے یہ بھول جاتے ہیں اور انجان ہوجاتے ہیں کہ جس مذہب نے خاص شرطوں کے ساتھ ہی سہی لیکن حج کے بنیادی اسلامی رکن سے عورتوں کو سفر سخت دشواری اور خطرناکی کے باوجود محروم نہیں کیا اور کعبۃ اللہ کے حرم کے پٹ عورتوں پر نہیں بھیڑے، جس پیغمبرؐ کی مسجد کا ایک دروازہ باب النساء عورتوں کا دروازہ کہلاتا رہا اور کہلاتا ہے، اس کے پیروکار ایک ایسے سماج کی تخلیق کا سبب بن گئے جس میں عورت اور مسجد دونوں ایک دوسرے کے لیے شجر ممنوعہ ہو کر رہ گئے۔ جس مسجد میں جلیل القدر خلیفہ اور صحابی کے قتل اور شہادت کے باوجود کسی کے لیے جگہ مخصوص نہیں ہوئی تھی، اسی میں امراء کے لیے خاص جگہیں رکھی گئیں۔ جو منبر عبادت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے قائم ہوا تھا، وہ بادشاہوں کا خطبہ پڑھنے اور حریفوں کو کوسنے کی جگہ بنادیا گیا۔ جو بیت المال حلال آمدنی کا خزانہ تھا اور امت کے ضرورتمندوں اور زندگی کو عبادت بنانے کے کاموں میں خرچ ہوتا تھا، ناجائز کمائی کا دفینہ بے رحم بادشاہوں کی ذاتی طاقت واقتدار کا ذریعہ اور خبر نہیں کیا کیا قرار پا گیا اور کسی کو آنکھوں کے یہ شہتیر نظر نہ آئے۔ دکھائی دیا تو یہ دکھائی دیا کہ مسلمان عوام اور غیر مسلمان حضرات خانقاہوں، میں یکساں بھیڑ کیوں لگانے لگے۔ کہیں خانقاہ کا وجود انہیں اس لیے تو نہیں کھٹکتا رہا کہ وہاں کے حاضر باش سرکاروں درباروں کے خود ساختہ اسلام، منبر سے کی جانے والی دماغی دھلائی اور اسی طرح کی بہت سی باتوں سے اپنے آپ کو بچاتے رہے تھے!

خانقاہ کی ضرورت کے سلسلے میں مجھے اس وقت صرف اتنا یادآرہا ہے کہ مسجد کے مخصوص آداب اورشرائط بھی ہیں۔ ابتدا میں جب وسائل محدود تھے۔ مجبوری کے تحت رخصتیں بھی تھیں۔ بعد میں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ یا یہ ضرورت پیدا ہوگئی کہ آداب وشرائط کا لحاظ نہ رکھ سکنے والے اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ ان کے لیے الگ اور بڑی جگہ چاہیے۔ چشتیوں کے نظامیہ نصیر یہ سلسلے کے ایک مشہور بزرگ حضرت مولانا فخر الدین محبّ النبیؒ ،حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے ہمعصر ہیں۔ ان کا زمانہ آتے آتے سرکار دربار نے سماج کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ لوگ شرابیں پی پی کر درانہ مذہبی علماء کے پاس آجاتے تھے۔ ایسا ہی ایک شخص حضرت مولانا فخر کی خدمت میں بھی آتا تھا۔ اس عادی نشے باز سے نشہ چھڑانا آسان کام نہ تھا۔ حضرت مولانا موقع کی تلاش میں تھے اور وہ موقع اس وقت آیا جب ایک روز یہ شخص اتنی زیادہ شراب پی کر آیا کہ آتے ہی قے کرنے لگا۔ حضرت نے صوفیوں کی اور اہلِ اسلام کی قدیم اور مسنون روایت کے مطابق اس سے نفرت کا برتاؤ نہیں فرمایا۔ اس کو آگے بڑھ کر خود سنبھالا اور اس کوشش میں حضرت کا سارا لباس غلاظت سے آلودہ ہوگیا۔ عام لوگوں کو غصہ آیا، مگر حضرت کی آنکھوں میں آنسو آئے اور ارشاد کیا کہ میں ابھی جاکر کپڑے بدل لوں گا ، لیکن یہ تو سوچو کہ اگر میں اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دینے کا عادی ہوتا تو یہ میری باتیں اتنے دن تک کیسے سنتا؟ اس کا تو دل ٹوٹ جاتا۔ ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا مشکل کام ہے! حضرت تو یہ ارشاد کرکے قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ حضرت کے پیچھے شرابی کو ہوش آیا اور حواس درست ہونے کے بعد اسے پتہ چلا کہ نشے نے آج کیا غضب ڈھایا ہے، تو اسے بے حد شرم آئی۔ اسی وقت ہمیشہ کے لیے شراب سے توبہ کرلی۔ یہ کام نہ مسجد میں ممکن تھا، نہ ہزاروں وعظ ایسا اثر دکھا سکتے تھے، جو خانقاہ کے ایک طرزِعمل نے کردکھایا۔

زیر بحث موضوع کے تحت اس مسئلے پر گفتگو ابھی باقی ہے، کہ تصوف کی تہذیب کس نے ،کس کس طرح کی۔ اس تہذیب کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ...پیش نظر مضمون کا عنوان کا یہ مقصد تھا کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف بنایا سنوارا کس نے ہے؟ تو میں... یہ عرض کرسکتا ہوں کہ جب اسلام کو بنانے سنوارنے والی بس ایک مبارک ذات تھی، یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باجود ! تو تصوف کے لیے کوئی اور بنانے سنوارنے والا کہاں سے آجاتا؟ تعمیر اور تزکیے اور تجلی کا سارا کام تو ہو ہی چکا تھا، اسلام کی نوک پلک درست کرنے میں کوئی

بات چھوڑی گئی ہوتی تو کسی مشاطگی کی ضرورت اور کسی beautician کی حاجت بھی رہتی۔ حضرت قبلہ جہان وجہانیان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ساری آرائش اور ساری تہذیب بہ نفس نفیس خود ہی فرمادی تھی۔ مشاطگی ادھورے حسن کو پورا حسن بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں حسن پہلے ہی سے مکمل ہو وہاں غازہ وسرخی کچھ بناتے نہیں، کچھ بگاڑی ہی دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اسلام میں ہر بدعت نامشروع اور ناپسندیدہ قرار پائی اور اہل تصوف نے ذکرِ الٰہی تک کے ان طریقوں کو قابلِ تقلید نہیں مانا جنکی سند پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتی نہ ہو اور متصل نہ ہوتی ہو! دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے تواتر اور تسلسل اور نمونے کی شرط بھی اسی لیے رکھی گئی ہے کہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ نے فرمالیا تھا، حدیث شریف کو صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے محدثین نے دنیا کی تاریخ میں ایک بے مثال طریقے سے پورے صحت کے ساتھ قائم وبرقرار رکھا، لیکن قرآن وحدیث سے زندگی نے جو خوشنما پیکر تراشا تھا، اس کا نمونہ بھی جوں کا توں ہر زمانے میں موجود رہنا ضروری تھا۔ سو صوفیائے کرام کی صورت میں موجود رہا۔ اسلام کے قرن اوّل کے بعد جو زمانہ آیا وہ ذاتی مصلحتوں اور خودغرضیوں سے خالی نہیں رہا تھا۔ یہ زمانہ سچے مسلمانوں کے لیے سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ کربلا کی قربانیاں اس امتحان میں کامیاب رہنے ہی کے لیے دی گئی تھیں۔ ملوکیت اور بادشاہ گردی کے طوفان اور آندھیاں اسلام کے نومولود ہرے بھرے پودے کے لیے سخت نقصان دہ تھیں۔ صوفیاء نے جہاں تک ہوسکا سرکار دربار کے مضر اثرات سے مسلم سوسائٹی کو بچایا اور ملوکیت کی زبردست یلغار کو روکنے کے لیے سپر بن گئے۔ خانقاہ اس دور میں مسجد کے لیے ایک بیرونی حصار تھی اور روحانیت کے نازک پودوں کے لیے ایک گرین ہاؤس اور نرسری! سیاسی استبداد کو جھیلنے کے لیے صوفیاء کی سی مضبوط شخصیتیں اور خانقاہ کا سا محفوظ اور مامون چار دیواری رکھنے والا ادارہ نہ ہوتا تو خدا جانے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا۔ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی وہ بزرگ ہیں جن سے بادشاہِ وقت، سلطان محمد تغلق، بظاہر عقیدت رکھتا تھا اور اپنی حکومت کو ان کے پیر ومرشد، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، کے ایک آشیرواد اور Blessing کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے حضرت پیر نصیرالدینؒ اور ان کے پیر بھائیون کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اس کی پوری تفصیل حضرت امیر خورد کرمانی کی کتاب سیرالاولیاء میں موجود ہے۔ حضرت پیر نصیر الدینؒ کے جانشین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے بھی دکن کے بادشاہ بظاہر عقیدت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت کو شہر کا قیام

چھوڑ کر باہر تشریف لے جانا پڑا۔ سچ پوچھیئے تو سلطانوں کے عام مذہب کی طرح اسلامی دور کے حکمرانوں کا اصل مذہب بھی ان کے تخت کی مصلحتیں رہیں۔ اسلام کا نام ان کی زبان پر اس وقت آتا، جب اسلام ان کا مخالف نہ بنتا ہو، یا اسلام کا نام لینے سے انہیں کچھ سیاسی فائدہ پہنچتا ہو، یا پھر جب مذہب ان کی ایک پرائیویٹ چیز بن کر رہ سکتا ہو۔ حالانکہ دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں تمام وکمال مانا جائے۔ خانقاہیں ایسے ہی مراکز کی حیثیت رکھتی رہی ہیں جہاں مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے یا یادِ الٰہی کے اعتکاف سے فارغ ہوکر عوام دین کی باقی باتیں ارادے یعنی ارادت اور کوشش یعنی جد وجہد سے اور کچھ وقت لگا کر سیکھیں۔ اگر مسجد میں یہ کام عہدِ نبوی کی طرح ہوتا رہتا تو مسجدیں ہی خانقاہ بھی بنی رہتیں۔ مگر افسوس تو اسی بات کا ہے کہ مسجد کی خانقاہیت کو ختم کر دیا گیا۔ اور عورتوں کو مسجد سے دور کر کے گویا ہر نئی نسل اور نئی پیڑھی پر ''اسلامی گوڈ'' کا دروازہ بند ہوا۔ مگر ایک در بند ہوتو اللہ تعالیٰ ستر در کھول بھی دیتا ہے۔ مسلمان عورتیں بھاگوان تھیں کہ ان پر یہ ستر خانقاہ بن کر کھل گئے اور نسوانی جبلت اور تقاضے انہیں شرک کے مرکزوں میں نہ پہنچا سکے!

میرے اس مضمون کے عنوان کا آخری رکن '' رسم''اور حقیقت سے متعلق ہے ۔ بے چاری رسوم کو آج کل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بدنام کر دیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ اتنی بری ہیں نہیں جتنا برا ہم نے انہیں سمجھ لیا ہے۔ رسمیں اچھی بھی ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں۔ اچھی رسموں کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے دین سے واقف بزرگوں نے انہیں اختیار کیا ہے۔ بری رسموں کا ترک لازم ہے اور صوفیاء نے انہیں ترک کیا ہے۔ خود تصوف چونکہ رسم نہیں ہے، اس لیے اس کے ترک واختیار کا سوال بھی اس طرح نہیں اٹھتا جس طرح اٹھایا جارہا ہے۔

رسمیں اچھی نہ ہوتیں تو نماز کے لیے ظاہری ارکان کیوں مقرر ہوتے؟ رسوم نے خدا کی عبادت اور یاد کو ایک تجریدی آرٹ اور Abstract سی چیز بننے سے روکا ہے۔ رسم تو وہ چیز ہے جس کے ذریعہ شریعت نے عبادت کو خط وخال اور مخصوص ظاہری صورت عطا کی ہے۔ ہر رسم عبث چیز ہے اور عبث ہونیکی بناء پر نا مناسب ٹھہرتی تو قرآن یہ نہ فرماتا کہ:

انّ الصّفاء والمروة من شعائر اللّٰه فمن حجّ البيت اواعتمر فلا جناح عليه ان يّطوّف بهما۔

(صفااور مروہ من جملہ یادگار (دین) خدا وندی ہیں۔ سو جوشخص حج کرے بیت (اللہ) کا یا

(اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں۔ ان دونوں کے درمیان آمدو رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے۔) (ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانوی)

اس مبارک آیت میں ''فلا جناح علیه'' (اس پر ذرا بھی گنا ہ نہیں) کے الفاظ خاص طور پر غور کے قابل ہیں یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن کے نزول سے قبل کچھ عجب نہیں کہ بعض لوگوں کے ذہن میں الجھن پڑتی ہو کہ نعوذ باللہ سعی کرنے سے فائدہ ہی کیا؟ اور خدانخواستہ جب فائدہ نہیں تو یہ گناہ کی چیز تو نہیں ہوگئی۔ قرآن کی اس آیت نے صرف اسی زمانے کی الجھن کو دور نہیں کیا، بعد کے زمانے کی الجھنوں کو بھی سلجھا دیا۔

اہلِ تصوف اپنی تمام رسوم کی سند علمائے ظاہر اور علمائے معروف کی طرح قرآن وحدیث سے لاتے ہیں اور جس رسم کی کوئی سند نہ ملے اس کو کوئی بھی معتبر اہل تصوف معتبر نہیں جانتا! جس چیز کی للّٰہیت روز مرہ کی زندگی اور اس کے تعینات اور تنزلات سے دور ہوتی اور ایک خالص تجریدی حیثیت رکھتی تو غالبًا نہ کعبے اور نہ مسجد کی اجازت ملتی، نہ طواف اور سعی کی، نہ رمی جمار اور کعبے کے غسل اور احرام کی اور نہ انسانوں کے جسم پر لپیٹے جانے والے بے سلے سفید احرام کی!

سب جانتے ہیں کہ کعبے کا دائمی لباس تو کالے غلاف کا ہے، لیکن حج کے ایام میں ایک نیا کپڑا احرام کے نام سے بھی اس کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ کعبے کا غسل بھی ہوتا ہے۔

اگر اسلام کے مرکز میں قائم اور جاری ان رسوم کو دھیان میں رکھا جائے تو نہ یہ کہ صرف تصوف کو عبث رسوم کا مجموعہ کہنے سے گریز کیا جائے گا بلکہ اہل تصوف کے یہاں رائج رسوم پر بھی شبہے کی وہ نظریں نہیں ڈالی جائیں گی جو ڈالی جارہی ہیں۔ غلط فہمیاں زیادہ تر ناواقفیت کی بناء پر ہیں اور تھوڑی نہیں بہت ہیں۔ خدا کرے وہ دور ہوسکیں اور موجودہ زمانے میں اور آنے والے زمانے میں سب مسلمان مل کر اسلام کا وہ حق ادا کرسکیں جو گذشتہ زمانے میں انہوں نے ادا کیا ہے۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکے گا جب اس واضح بات کو سمجھ لیا جائے کہ تصوف پورے اور اصلی اسلام کی طرف لے جانے کا ایک عمل ہے۔ کوئی علیحدہ فرقہ، کوئی علیحدہ فلسفہ کوئی علیحدہ عقیدہ نہیں ہے۔

نہ تو یہ انار کی ہے، نہ افراط وتفریط۔ یہ تو ایک خالص سائنسی رویہ ہے جو ہم کو کتابی اور نظریاتی فارمولوں سے آگے بڑھا کر تجربے سے بھی گزارتا ہے۔ کون سا صوفی آج تک ایسا ہوا ہے جس نے محض کتاب پڑھ کر سلوک طے کرلیا ہو۔ یا کون سا عارف ایسا گزرا ہے جس نے تجربات کے سمندر کو

عبور کیے بغیر کسی نتیجے تک رسائی حاصل کی ہو؟ سلوک کو بیان کرنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے بڑے اچھوتے، نادر اور دلکش اسلوب اختیار کیے ہیں۔ اگر آج کے دن مجھے کسی طبی لیبا ریٹری کے تشبیہہ و استعارے کو استعمال کرنے کی اجازت ملے تو عرض کروں گا کہ سلوک کی ساری نسخہ سازی اور سارے تجربات نہ تو برٹش فارما کو پیا کے تحت ہوتے ہیں، نہ نہایت مفید اور قابل احترام انڈین فارما کو پیا کے تحت۔ یہ تو شروع سے آج تک صرف اورصرف شریعت اسلامیہ اور طبّ نبوی کے تحت ہوتے آئے ہیں، ہورہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

جی چاہتا ہے کہ ان گذارشات کا اختتام خود حضرت خواجہ گیسو دراز کے ذکر پاک پر ہو کہ مجھے اپنے مضمون کو سمیٹنے اور اس کا خلاصہ بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر اور اتنے کم الفاظ اور کہیں نہیں مل رہے ہیں۔ ۲۹/ ماہ رجب ۸۰۲ھ جمعہ کا دن ہے۔ کوئی شخص حضرت سے مرید ہونے آتا ہے۔ حضرت اس کا ہاتھ تھامتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ اس ضعیف کے خواجہ اور سلسلے کے تمام مشائخ سے عہد کرو کہ تم اپنی آنکھ اور زبان کو قابو میں رکھو گے اور شریعت پر عمل پیرا رہو گے۔ کیا تمہیں یہ عہد کرنا منظور ہے مرید کہتا ہے جی ہاں قبول ہے: تصوف کی پوری تاریخ وتہذیب، رسم وحقیقت بس انہی دوبولوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو میں دو بول پڑھنے یا پڑھوانے کا محاورہ نکاح اور گھر بسنے سے متعلق ہے۔ تصوف بھی شریعت کو شریکِ حیات بنانے کا قصہ ہے! نکاح اور گرہ کی رسم کے ساتھ!

حواشی

۱۔ سورہ مائدہ آیت ۳

۲۔ تاریخ مشائخ چشت، جلد اوّل، باب دوم، صفحہ ۴۰

۳۔ ایضاً

۴۔ کتاب اللمع، صفحہ ۲۲

۵۔ مصارع العشاق، (مطبوعہ الجوائب قسطنطنیہ) صفحہ ۲۲۴، تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۴۴

۶۔ (بلوغ الادب، اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، جلد اوّل صفحہ ۵۲۹، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور،

۷۔ یہ روایت سند متصل کے طور پر ابومخنف سے ہشام بن عروہ تک جاتی ہے۔ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۴۴

۸۔ یہ رسم قبل اسلام سے آج تک قائم ہے کہ حج کے دوران حاجی اس وقت تک میدان

عرفات سے رخصت نہیں ہوتے جب تک انہیں ایک خاص اشارے کے ذریعے روانہ ہونے کی اجازت نہ دی جائے گویا بیت اللہ اور حج کی خاص خدمات میں سے یہ اہم خدمت عرصے تک صوفی کہلانے والوں کے پاس رہی۔

۹۔ مکتوبات صدی حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری اردوترجمہ، شائع کردہ۔ سعید کمپنی کراچی ،صفحات ۱۷۵ تا ۱۷۹

۱۰۔ ۔فوائد الفواد ۔ اُردو ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی ،مطبوعہ اردو اکیڈمی ، دہلی صفحہ ۲۲۷

۱۱۔ سیر الاولیاء ۔ اُردو ترجمہؒ مولانا اعجاز الحق قدوسی ،صفحہ ۶۰۶

۱۲۔ سیر الاولیاء صفحہ ۸۱۲

۱۳۔ فوائد الفواد: اُردو ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی ،صفحہ ۳۹۹۔۴۰۰

۱۴۔ جوامع الکلم (قلمی) بحوالہ تذکرہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ از پروفیسر نثار احمد فاروقی ،